ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 501

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: اصول و آدابِ افتا (501) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ 1 – 4)

کل نمبر: 100 کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

(مطالعہ و حوالہ کے لیے)

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کے متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کر کے جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

سوال نمبر 1: افتا، استفتا اور قضا کی حقیقت، باہمی تعلق اور امتیازات (20 نمبر)

سوال نمبر 1: افتا، استفتا اور قضا کی حقیقت واضح کرتے ہوئے ان کے باہمی تعلق اور امتیازات بیان کیجیے۔ (20 نمبر)

تعارف

اسلامی نظامِ علم و عمل میں افتا، استفتا اور قضا تین بنیادی ادارے ہیں جن کے ذریعے شریعت کے احکام عام انسانوں کی زندگی تک پہنچتے ہیں اور ان پر عمل درآمد کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ ایک عام مسلمان جب کسی مسئلے میں شرعی حکم معلوم کرنا چاہتا ہے تو استفتا کرتا ہے، عالم دین تحقیق کے بعد جو جواب دیتا ہے وہ افتا کہلاتا ہے، اور جب دو فریقوں کے درمیان تنازع فیصلے کے لیے پیش ہو تو ریاست کی طرف سے مقرر کردہ جج جو فیصلہ صادر کرتا ہے وہ قضا ہے۔ یہ تینوں اصطلاحات اگرچہ ایک ہی علمی فضا سے تعلق رکھتی ہیں، تاہم ہر ایک کی حقیقت، شرائط اور اثرات دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں فرق نہ سمجھنے سے فتویٰ کو عدالت کا فیصلہ سمجھ لینے یا عدالت کے فیصلے کو محض رائے قرار دینے جیسی

غلطیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس جواب میں پہلے تینوں کی لغوی و اصطلاحی حقیقت واضح کی جائے گی، پھر ان کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی جائے گی اور آخر میں ان کے درمیان بنیادی امتیازات جدول کی صورت میں بھی پیش کیے جائیں گے۔

افتا کی حقیقت

افتا عربی لفظ "فتیٰ" سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی جوان اور تازہ کے ہیں؛ مسئلہ بتانے کو فتویٰ اس لیے کہا گیا کہ مفتی مشکل مسئلے کو قوتِ علم سے واضح کر دیتا ہے، گویا مسئلہ تازہ و توانا ہو جاتا ہے۔ اصطلاح میں افتا سے مراد کسی پیش آمدہ مسئلے میں شرعی حکم دلیل کی بنیاد پر بیان کرنا ہے، بشرطے کہ یہ بیان الزام و نفاذ کی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ امام نووی نے "المجموع" کے آغاز میں آدابِ فتویٰ بیان کرتے ہوئے افتا کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم کی خبر دینا قرار دیا ہے، اور ابن القیم نے "اعلام الموقعین" میں مفتی کو "رب العالمین کی طرف سے دستخط کرنے والا" کہا ہے، کیونکہ وہ جو کچھ کہتا ہے اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اسی لیے فتویٰ کی حیثیت علمی و شرعی رہنمائی کی ہے: وہ مستفتی کو حکم بتا دیتا ہے، مگر اس پر عمل کرانے کی قوت مفتی کے پاس نہیں ہوتی؛ عمل کرنا مستفتی کے ضمیر اور اس کے خدا سے تعلق پر موقوف رہتا ہے۔

افتا کی اس حقیقت سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں: ایک یہ کہ فتویٰ دینے کے لیے علم اور اہلیت شرط ہے، کیونکہ بغیر علم کے اللہ کی طرف کوئی بات منسوب کرنا قرآن کی رو سے سنگین جرم ہے؛ دوسری یہ کہ فتویٰ بدل بھی سکتا ہے، کیونکہ وہ مفتی کے فہم اور اجتہاد کا نتیجہ ہوتا ہے اور زمان و مکان، عرف و احوال اور خود مسئلے کی صورت بدلنے سے حکم کا اطلاق بھی بدل سکتا ہے۔ ابن القیم نے اسی بنیاد پر فتویٰ کے تغیر کے اسباب پر باقاعدہ فصل قائم کی ہے۔

استفتا کی حقیقت

استفتا، افتا کی طلب کا نام ہے، یعنی کسی شرعی مسئلے میں اہلِ علم سے حکم دریافت کرنا۔ جو شخص سوال پوچھتا ہے وہ مستفتی اور جس سے پوچھا جاتا ہے وہ مفتی کہلاتا ہے۔ قرآن مجید نے استفتا کے لفظ کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے: "یستفتونک قل اللہ یفتیکم" (النساء: 127) اور عام مسلمانوں کو حکم دیا گیا: "فسئلوا اہل الذکر ان کنتم لا تعلمون" یعنی اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لو (النحل: 43)۔ اس آیت سے فقہا نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ جو شخص خود اجتہاد کی اہلیت نہ رکھتا ہو اس پر لازم ہے کہ اہلِ علم سے رجوع کرے۔ استفتا درحقیقت افتا کی بنیاد اور محرک ہے: جب تک کوئی پوچھنے والا سوال لے کر نہ آئے، فتویٰ کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ اسی لیے کتابوں میں "آداب المفتی والمستفتی"

کا باب ہمیشہ ساتھ ساتھ ذکر ہوتا ہے۔ مستفتی کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مسئلہ اپنی پوری صورت کے ساتھ، بغیر کچھ چھپائے، اہل وثقہ عالم کے سامنے رکھے، کیونکہ حکم واقعے کی درست تصویر پر تعمیر ہوتا ہے؛ صورت بدل جائے تو حکم بھی بدل جاتا ہے۔

قضا کی حقیقت

قضا کے لغوی معنی فیصلہ کرنے، کسی کام کو حتمی طور پر تمام کرنے اور حکم نافذ کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں قضا سے مراد ریاست کی ولایت واختیار کے تحت فریقین کے تنازعات کا ایسا فیصلہ ہے جو شرعاً و قانوناً نافذ ہو اور جس کی تعمیل فریقین پر لازم آئے۔ قاضی وہ شخص ہے جسے حاکمِ وقت نے باقاعدہ تقرر کے ذریعے یہ منصب سونپا ہو؛ وہ ثبوت وشہادت کے ضوابط کی پابندی کرتا ہے، فریقین کو سماعت کا موقع دیتا ہے، اور اس کا فیصلہ نافذ العمل ہوتا ہے جسے ریاستی قوت عمل میں لاتی ہے۔ قرآن مجید نے قضا کا منصب انبیا اور ان کے بعد حکمرانوں کو عطا کیا: ”یاداود اِنا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق“ (ص: 26)، اور نبی کریم ﷺ خود مدینہ میں قاضی کی حیثیت سے فیصلے فرماتے تھے اور صحابہ کو مختلف علاقوں میں قاضی مقرر کر کے بھیجتے تھے، جیسے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجنا مشہور ہے۔ قضا کا دائرہ خصومات وحقوق کے فیصلوں تک محدود ہوتا ہے اور یہ منصب اجتماعی نظم وضبط اور عدل کے قیام کی ضمانت ہے۔

تینوں کا باہمی تعلق

افتا، استفتا اور قضا کا باہمی تعلق کئی جہتوں سے قائم ہے۔ پہلی جہت منبع کی وحدت ہے: تینوں کا ماخذ قرآن وسنت اور ان سے مستنبط فقہی علم ہے؛ مفتی بھی شریعت کا حکم بتاتا ہے اور قاضی بھی اسی شریعت کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ دوسری جہت علت کی شرکت ہے: تینوں کا مقصد انسانی زندگی کو وحی کی رہنمائی سے جوڑنا اور عدل وحق کا قیام ہے۔ تیسری جہت عملی تسلسل ہے: استفتا، افتا کی شرط ہے؛ قضا میں بھی اکثر پیچیدہ مسائل پر قاضی علما سے مشورہ کرتا ہے اور کلاسیکی دور میں مفتی دار القضا سے وابستہ رہتا تھا جو قاضی کو فقہی رہنمائی فراہم کرتا تھا۔ چوتھی جہت اشخاص کا اشتراک ہے: ایک ہی عالم مفتی بھی ہو سکتا ہے اور قاضی بھی، کیونکہ دونوں مناصب کے لیے فقہ میں مہارت بنیادی شرط ہے۔ پانچویں جہت یہ کہ فتویٰ قضا کی تکمیل کرتا ہے: عدالت صرف وہی فیصلہ کرتی ہے جو خصومت بن کر سامنے آئے، جبکہ زندگی کے ان گنت مسائل جہاں کوئی تنازع نہیں، وہاں فتویٰ ہی رہنمائی دیتا ہے؛ یوں افتا کا دائرہ قضا سے کہیں وسیع ہے۔

بنیادی امتیازات

ان تعلقات کے باوجود تینوں کے درمیان امتیازات نہایت واضح اور اہم ہیں۔ بنیادی فرق الزام و نفاذ کا ہے: فتویٰ اعلام ہے، الزام نہیں؛ مفتی حکم بتاتا ہے، اسے منوا نہیں سکتا، جبکہ حکمِ قضا الزام ہے جس کی خلاف ورزی پر سزا و تعزیر ہو سکتی ہے۔ دوسرا فرق موضوع کا ہے: قضا کے لیے خصومت و دعویٰ شرط ہے، بغیر مدعی و مدعا علیہ کے قضا قائم نہیں ہوتی، جبکہ افتا میں کوئی تنازع ضروری نہیں؛ ایک فرد اپنی عبادت کے مسئلے میں بھی فتویٰ لے سکتا ہے۔ تیسرا فرق تقرر و اختیار کا ہے: قاضی ریاست سے باقاعدہ مقرر ہوتا ہے اور اس کی ولایت اسی دائرہ اختیار تک محدود رہتی ہے، جبکہ مفتی کے لیے رسمی تقرر شرط نہیں؛ اس کی اہلیت علم و ثقہ ہونا ہے، البتہ منظم دور میں دار الافتا کے قیام سے مفتی کا تقرر بھی ادارہ جاتی ہو گیا۔ چوتھا فرق ثبوت کے ضوابط کا ہے: قاضی شہادت، اقرار اور قسم جیسے ظاہری ثبوتوں کا پابند ہوتا ہے اور اس کا فیصلہ ظاہر پر ہوتا ہے، جبکہ مفتی سوال میں بیان کردہ صورت کو بنیاد بناتا ہے اور باطنی حالت تک بھی رہنمائی کر سکتا ہے؛ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ قضا ظاہر پر اور فتویٰ دیانۃً بھی ہو سکتا ہے۔ پانچواں فرق تبدیلی کا ہے: ایک مسئلے میں فتویٰ تحقیق و اجتہاد کے بدلنے سے بدل سکتا ہے، مگر قاضی کا حتمی فیصلہ اسی خصومت میں دوبارہ کھل نہیں سکتا، ورنہ عدالتی نظام کا استحکام ختم ہو جائے۔ چھٹا فرق دائرہ اثر کا ہے: فتویٰ ایک عام اصول بھی بیان کر سکتا ہے جو ہزاروں افراد کے لیے رہنما ہو، مگر قضا کا فیصلہ صرف اسی واقعے اور ان ہی فریقین پر نافذ ہوتا ہے۔

جدول 1: افتا اور قضا کا تقابلی خلاصہ

پہلو	افتا	قضا
نوعیت	شرعی حکم کی خبر و رہنمائی	تنازع کا حتمی و نافذ فیصلہ
الزام	الزام نہیں، عمل ضمیر پر موقوف	الزام ہے، تعمیل لازمی
شرطِ آغاز	استفتا (سوال) کافی ہے	دعویٰ و خصومت ضروری ہے
منصب کی بنیاد	علم و اہلیت	ریاستی تقرر و ولایت
تبدیلی	صورت و تحقیق بدلنے سے بدل سکتا ہے	حتمی، اسی خصومت میں دوبارہ نہیں کھلتا

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ افتا، استفتا اور قضا شریعت کے نفاذ کے ایک ہی نظام کے تین باہم مربوط مگر الگ الگ ادارے ہیں۔ استفتا اس دروازے کا نام ہے جہاں سے عام انسان علم کی طرف رجوع کرتا ہے، افتا اس جواب کا نام ہے جو اہلِ علم دلیل کی بنیاد پر دیتے ہیں، اور قضا اس فیصلے کا نام ہے جو ریاست کا مقرر کردہ جج خصومات میں نافذ العمل حیثیت سے صادر کرتا ہے۔ ان میں اشتراک ماخذ و مقصد کا ہے اور امتیاز الزام، موضوع، ثبوت کے ضوابط اور دائرہ اثر کا۔ طالب علم کے لیے یہ فرق سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ وہ نہ فتویٰ کو عدالتی فیصلہ سمجھ کر اس کی نافرمانی کو جرم قرار دے، نہ عدالتی فیصلے کو محض ایک رائے سمجھ کر اس کی اہمیت گھٹائے، بلکہ ہر ادارے کو اس کے اپنے مقام و مرتبے پر رکھ کر شریعت کے مقاصد تک رسائی حاصل کرے۔

سوال نمبر 2: مفتی اور مستفتی کے علمی و اخلاقی آداب (20 نمبر)

سوال نمبر 2: مفتی اور مستفتی کے علمی و اخلاقی آداب کیا ہیں؟ قرآن و سنت اور فقہی روایت کی روشنی میں ان آداب کی اہمیت اور ان سے انحراف کے نتائج پر بحث کیجیے۔ (20 نمبر)

تعارف

اسلام میں فتویٰ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ وہ امانت ہے جس میں مفتی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم بیان کرتا ہے۔ اسی عظیم ذمہ داری کی وجہ سے علما نے افتا کے لیے علمی اہلیت و شرائط کے ساتھ ساتھ باقاعدہ آداب بھی مقرر کیے ہیں، نہ صرف مفتی کے لیے بلکہ مستفتی کے لیے بھی۔ امام ابن الصلاح نے اپنی کتاب "ادب المفتی والمستفتی" میں، امام نووی نے "المجموع" کے مقدمے میں اور ابن القیم نے "اعلام الموقعین" میں ان آداب کو بڑی تفصیل و اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان آداب کی دو بڑی قسمیں ہیں: علمی آداب، جن کا تعلق علم، تحقیق اور طریقہ کار سے ہے، اور اخلاقی آداب، جن کا تعلق نیت، تقویٰ، تواضع اور حسنِ سلوک سے ہے۔ اس جواب میں پہلے مفتی کے آداب، پھر مستفتی کے آداب بیان ہوں گے، پھر قرآن و سنت کی روشنی میں ان کی اہمیت اور آخر میں ان سے انحراف کے نقصانات پر بحث کی جائے گی۔

مفتی کے علمی آداب

مفتی کا پہلا علمی ادب یہ ہے کہ وہ اسی مسئلے میں فتویٰ دے جس میں اسے کامل گرفت و بصیرت حاصل ہو۔ اہلیت کے علمی تقاضوں میں قرآن و سنت کا گہرا مطالعہ، آیات و احادیث کے ناسخ و منسوخ کی معرفت، اجماع و اختلاف کے مقامات کا علم، قیاس و اصولِ فقہ پر عبور، مقاصدِ شریعت کی سمجھ، عربی زبان میں مہارت اور اپنے مسلک کے معتمد مصادر کی واقفیت شامل ہیں۔ دوسرا ادب تحقیق و تثبت ہے: مفتی مسئلے کی پوری تصویر سمجھے بغیر جواب نہ دے، سوال مبہم ہو تو وضاحت طلب کرے، اور جلد بازی ہرگز نہ کرے، کیونکہ فتویٰ میں عجلت اکثر غلطی کا سبب بنتی ہے۔ تیسرا ادب دلیل کی بنیاد پر ترجیح کرنا اور قولِ معتمد کو اختیار کرنا ہے؛ مفتی ذاتی خواہش یا وقتی مقبولیت کے لیے شاذ و مرجوح قول نہ اختیار کرے۔ چوتھا ادب مصادر کی جدید و قدیم تحقیق سے خود کو باخبر رکھنا اور جدید مسائل میں اہلِ فن (طبی، معاشی، سائنسی) کی رائے ضروری ہو وہاں ان سے استفادہ کرنا ہے، کیونکہ حکم کی بنیاد واقعے کی درست تفہیم پر ہوتی ہے۔ پانچواں ادب یہ ہے کہ اختلافِ علما کو امانت داری سے بیان کرے اور جس مسئلے میں خود مطمئن نہ ہو وہاں "لاادری" (میں نہیں جانتا) کہنے سے نہ جھجکے؛ سلف کی سیرت میں یہ جملہ علم کی نصف دلیل سمجھا گیا ہے۔

مفتی کے اخلاقی آداب

اخلاقی آداب میں سرِ فہرست تقویٰ و اخلاص ہے: مفتی فتویٰ کسی دنیوی غرض، شہرت، مال یا کسی کی خوشنودی کے لیے نہ دے بلکہ خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے دے، کیونکہ فتویٰ کو شہرت و مفاد کا ذریعہ بنانا اس امانت کی خیانت ہے۔ دوسرا ادب تواضع و انکساری ہے؛ مفتی اپنے علم پر غرور نہ کرے، سوال کرنے والے سے نرمی و شفقت سے پیش آئے، اس کی جہالت پر طنز نہ کرے اور اس کے سوال کا تحمل سے جواب دے۔ تیسرا ادب خوفِ خدا اور جواب کی ذمہ داری کا احساس ہے؛ ابن القیم کے الفاظ میں مفتی کا دستخط گویا رب العالمین کے حضور پیش ہونے والا دستخط ہے، اس لیے غلط فتویٰ کا بوجھ آخرت میں اسی کے سر ہو گا۔ چوتھا ادب یہ ہے کہ فتویٰ دیتے وقت اللہ سے دعا و استخارہ کرے، اہلِ علم سے مشورہ کرے اور اجتماعی غور و فکر کو انفرادی رائے پر ترجیح دے، جیسا کہ سلف کا معمول تھا۔ پانچواں ادب سائل کی رازداری اور عزتِ نفس کا تحفظ ہے؛ مفتی مستفتی کے پوچھے گئے مسئلے کو دوسروں کے سامنے افشا نہ کرے اور نہ اسے رسوا کرے۔ چھٹا ادب یہ کہ اگر بعد میں اپنی غلطی ظاہر ہو جائے تو بلا تردد رجوع کرے، کیونکہ حق کی طرف لوٹنا اہلِ علم کی شان ہے، غلطی پر اصرار نہیں۔

مستفتی کے علمی و اخلاقی آداب

مستفتی پر بھی کئی آداب لازم ہیں۔ علمی آداب میں پہلا یہ کہ وہ اہل و ثقہ عالم ہی سے سوال کرے، ہر ایرے غیرے سے نہ پوچھے، کیونکہ قرآن کا حکم "اہل الذکر" سے پوچھنے کا ہے، یعنی اس فن کے ماہر سے۔ دوسرا ادب یہ کہ وہ مسئلہ پوری سچائی اور مکمل تفصیل کے ساتھ پیش کرے؛ کوئی پہلو چھپائے نہیں، کیونکہ چھپی ہوئی صورت پر دیا گیا فتویٰ اس کے اصل واقعے پر لاگو نہیں ہو گا۔ تیسرا ادب سوال کی وضاحت ہے: مبہم یا فرضی سوالات کے بجائے اپنا اصل واقعہ صاف الفاظ میں بیان کرے۔ اخلاقی آداب میں پہلا ادبِ احترام ہے: عالم کے ساتھ ادب سے گفتگو کرے، بحث و تکرار اور امتحان لینے کی نیت سے سوال نہ کرے۔ دوسرا ادب یہ کہ اپنی خواہش کے مطابق جواب حاصل کرنے کے لیے مفتی بہ مفتی نہ گھومے، یعنی "رخصت گردی" سے بچے؛ البتہ کسی اور ثقہ عالم سے مسئلہ کی تصدیق کے لیے رجوع کرنا اہلِ علم کے نزدیک جائز ہے بشرطے نیت اصلاح و اطمینان ہو۔ تیسرا ادب یہ کہ جواب ملنے پر اس پر عمل کرے، کیونکہ عمل کے بغیر محض علم جمع کرنا وہی رویہ ہے جس پر قرآن نے پچھلی امتوں کو تنبیہ فرمائی ہے۔ چوتھا ادب یہ کہ جن باتوں کا اس سے تعلق نہیں یا محض فضول تجسس ہے، ان میں سوال نہ کرے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بے فائدہ مسائل سے منع فرمایا ہے۔

قرآن و سنت اور فقہی روایت کی روشنی میں اہمیت

ان آداب کی بنیاد قرآن و سنت میں جابجا موجود ہے۔ قرآن نے بغیر علم کے بات کہنے کو صریح حرام قرار دیا: "ولا تقف ما لیس لک بہ علم" (الاسراء: 36) اور "قل إنما حرم ربي الفواحش... وأن تقولوا علی اللہ ما لا تعلمون" (الاعراف: 33)۔ مستفتی کے ادب کی بنیاد "فسئلوا أہل الذکر" (النحل: 43) ہے۔ سنت میں نبی کریم ﷺ نے بغیر علم فتویٰ دینے والے کو گناہ کا اصل ذمہ دار قرار دیا: جس شخص نے بغیر علم کے فتویٰ دیا تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہے (ابو داود)۔ اسی طرح آپ ﷺ نے اس واقعے میں، جہاں ایک زخمی شخص کو ساتھیوں نے بغیر تحقیق کے غسل کا فتویٰ دیا اور وہ جاں بحق ہو گیا، فرمایا کہ انہوں نے اسے قتل کیا؛ اگر علم نہ تھا تو پوچھ کیوں نہ لیا، کیونکہ لاعلمی کا شفا سوال ہے (ابو داود)۔ فقہی روایت میں ان آداب کو مستقل فن کی حیثیت دی گئی: ابن الصلاح کی "ادب المفتی والمستفتی"، نووی کے بیان کردہ آدابِ فتویٰ اور مذاہب کی معتمد کتابوں کے مقدمات اس روایت کی شاہد ہیں کہ امت نے فتویٰ کو ہمیشہ ایک باضابطہ و باادب عمل سمجھا ہے۔

آداب سے انحراف کے نتائج

ان آداب سے انحراف کے نتائج انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر سنگین ہوتے ہیں۔ انفرادی سطح پر غلط فتویٰ عبادت بگاڑ دیتا ہے، حلال و حرام میں اختلاط پیدا کرتا ہے اور مستفتی کو گناہ میں ملوث کرتا ہے جس کا اخلاقی بوجھ بھی مفتی پر لوٹتا ہے۔ بعض صورتوں میں غلط فتویٰ جان و مال کا نقصان کرتا ہے، جیسے طبی یا معاشی معاملات میں تحقیق کے بغیر دیا گیا جواب۔ اجتماعی سطح پر بے اصول افتا سے معاشرے میں انتشار پیدا ہوتا ہے: ایک ہی مسئلے میں متضاد فتوے عوام کو حیرانی و بداعتمادی میں مبتلا کرتے ہیں، فتویٰ بازی فرقہ وارانہ ہتھیار بن جاتی ہے، میڈیا و سوشل میڈیا پر آدھے ادھورے فتوے دین کا تاثر مسخ کرتے ہیں اور اہلِ علم کی وقعت مجروح ہوتی ہے۔ یہی انحراف آخر کار اس صورتحال کو جنم دیتا ہے جس سے نبی کریم ﷺ نے متنبہ فرمایا تھا کہ علم اٹھ جائے گا اور جاہل سرداروں سے فتوے لیے جائیں گے تو وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے (بخاری و مسلم)۔ لہٰذا آدابِ افتا کی پابندی محض تہذیبی خوبی نہیں بلکہ دین کے تحفظ کی عملی ضمانت ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ افتا ایک علمی و اخلاقی نظام ہے جس کے ہر فریق کے آداب مقرر ہیں۔ مفتی پر علم و تحقیق، تقویٰ و تواضع، تانی و مشورہ اور رجوع الی الحق لازم ہے، اور مستفتی پر اہل سے سوال، سچائی سے واقعہ پیش کرنا، ادبِ احترام اور جواب پر عمل لازم ہے۔ قرآن و سنت نے ان آداب کو وعید و ترغیب دونوں کے ساتھ قائم کیا اور فقہی روایت نے انہیں باقاعدہ فن بنا کر محفوظ کیا۔ جہاں یہ آداب ٹوٹتے ہیں وہاں فتویٰ رہنمائی کے بجائے فتنے کا سبب بن جاتا ہے؛ اور جہاں ان کی پابندی ہوتی ہے وہاں افتا امت کی وحدت، دین کی حفاظت اور انسانی زندگی کی اصلاح کا ذریعہ بنتا ہے۔

سوال نمبر 3: فتاویٰ قاضی خان: ترتیب، مصادر اور طرزِ استدلال (20 نمبر)

سوال نمبر 3: فتاویٰ قاضی خان کی ترتیب، مصادر اور طرزِ استدلال کا تجزیہ کیجیے اور اس مجموعے کا مقام واضح کیجیے۔ (20 نمبر)

تعارف

فقہ حنفی کی تاریخ میں فتاویٰ کے مجموعوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہی مجموعے ہیں جنہوں نے فقہ کو زمانے کے نئے واقعات (نوازل) سے جوڑا اور مذہب کی عملی صورت محفوظ کی۔ ان مجموعوں میں "الفتاویٰ الخانیہ" المعروف "فتاویٰ قاضی خان" کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ یہ چھٹی صدی ہجری کے عظیم حنفی فقیہ قاضی خان کی تصنیف ہے اور اپنی محتاط ترتیب، معتبر مصادر اور مدلل اسلوب کی بنا پر صدیوں سے درس، قضا اور افتا میں ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس جواب میں پہلے مصنف کا مختصر تعارف پیش کیا جائے گا، پھر کتاب کی ترتیب و تنظیم، اس کے مصادر، طرزِ استدلال، منہج اور آخر میں فقہ حنفی میں اس مجموعے کے مقام و مرتبے کا جائزہ لیا جائے گا۔

مصنف کا تعارف

کتاب کے مصنف فخر الدین حسن بن منصور بن محمود اوزجندی فرغانی ہیں جو "قاضی خان" کے نام سے مشہور ہوئے۔ "اوزجند" ماوراء النہر کے علاقے فرغانہ کا ایک شہر تھا، جہاں اس دور میں فقہ حنفی کا بڑا مرکز تھا۔ آپ کی وفات 592ھ (1196ء) میں ہوئی۔ آپ اپنے دور کے جید فقیہ، مفتی اور مصنف تھے؛ قاضی ہونے کی بنا پر قضا و افتا دونوں کا عملی تجربہ رکھتے تھے، اور یہی تجربہ ان کے فتاویٰ کو محض نظری بحث کے بجائے واقعات سے مربوط رکھتا ہے۔ قاضی خان کی دیگر تصنیفات میں شرح جامع الصغیر، شرح الزیادات، شرح ادب القاضی للخصاف اور الامالی فی الفقہ مشہور ہیں۔ فتاویٰ قاضی خان نے ان کی شہرت کو دوام بخشا اور بعد کے فقہا کے لیے یہ کتاب ان کے نام سے پہچانی جانے لگی۔

کتاب کی ترتیب و تنظیم

فتاویٰ قاضی خان کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی محتاط و منظم ترتیب ہے۔ قاضی خان نے کتاب کو فقہ کے روایتی ابواب کی ترتیب پر مرتب کیا: کتاب الطہارۃ سے آغاز ہو کر کتاب الصلوٰۃ، الزکاۃ، الصوم، الحج، النکاح، الطلاق، البیوع، الاجارۃ، الشفعہ، الرہن، الوکالۃ، الکفالۃ، الحوالۃ، القضاء، الشہادات، الوصایا اور آخر میں کتاب الفرائض تک مسائل سجائے گئے ہیں۔ ہر کتاب کے اندر مسائل کو "فصل" کی صورت میں چھوٹے چھوٹے عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے، جس سے قاری کے لیے مطلوبہ مسئلے تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ قاضی خان نے کتاب کے مقدمے میں اپنی ترتیب اور طریقہ کار کی خود وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ انہوں نے اس مجموعے میں کن روایات کو

بنیاد بنایا ہے۔ یہ اسلوب اس دور میں نسبتاً نیا تھا کیونکہ فتاویٰ کے بیشتر قدیم مجموعے واقعات کی تدوین تھے جن میں اس قدر باقاعدہ ابواب بندی و فصل بندی موجود نہ تھی۔ ترتیب کی یہ پختگی کتاب کو فتاویٰ کے مجموعے کے ساتھ ساتھ ایک جامع فقہی کتاب کی صورت بھی دیتی ہے۔

کتاب کے مصادر

قاضی خان کے مصادر کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انہوں نے مذہب حنفی کے معتبر ترین ذخیرے کو بنیاد بنایا ہے۔ ان مصادر کی وضاحت انہوں نے خود مقدمے میں کر دی ہے: (1) ظاہر الروایہ کی چھ کتب، یعنی امام محمد بن حسن الشیبانی کی المبسوط (الاصل)، الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، السیر الصغیر، السیر الکبیر اور الزیادات؛ یہ وہ کتابیں ہیں جن سے امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کے اقوال بہ سند روایت ہوئے۔ (2) النوادر کی کتب، جن میں ان تینوں ائمہ کی غیر ظاہر الروایہ اقوال آئی ہیں۔ (3) متقدمین و مشائخ کے فتاویٰ و واقعات کے مجموعے اور بلخ، بخارا و سمرقند کے مشائخ کے اقوال؛ ماوراء النہر کے مشائخ کو قاضی خان بالخصوص سے نقل کیا ہے۔ مقدمے میں وہ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ جہاں امام محمد کی کسی کتاب سے مسئلہ نقل ہو اسے اس ضابطے سے پہچانا جائے اور جہاں کسی بزرگ کا نام ہیں وہاں مقصد اس کی صرف مسئلے کی نسبت ہے۔ اس طرز سے کتاب کا ہر مسئلہ اپنے اصل ماخذ تک قابلِ رسد ہو جاتا ہے، جو فتاویٰ کی کتاب کے لیے علمی امانت کی بڑی خوبی ہے۔

طرزِ استدلال کا تجزیہ

قاضی خان کا طرزِ استدلال متوازن، محتاط اور عملی ہے۔ اس کی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

- مسئلہ اول، جواب بعد: ہر جگہ پہلے مسئلے کی صورت پوری وضاحت سے پیش کی جاتی ہے، پھر حکم بیان ہوتا ہے، جس سے واقعہ اور حکم کا تعلق واضح رہتا ہے۔
- روایات کی درجہ بندی: اختلافِ روایات کی صورت میں قاضی خان ظاہر الروایہ کو مقدم رکھتے ہیں اور اکثر یہ تصریح کر دیتے ہیں کہ کس قول پر فتویٰ ہے، جس سے مفتی کی رہنمائی ہوتی ہے۔
- مشائخ کے اقوال کی نقل و ترجیح: جہاں ائمہ کا صریح قول نہیں ملتا وہاں مشائخِ مذہب کے اقوال نقل کر کے ان میں سے حالات و عرف کے مناسب قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

- اختصار و جامعیت: عبارت مختصر مگر جامع ہے؛ غیر ضروری تطویل سے بچا گیا ہے، اسی لیے کتاب کا حجم فتاویٰ کے دیگر بڑے مجموعوں کی نسبت قابو میں ہے۔
- واقعات و نوازل سے ربط: قضا و افتا کے عملی تجربے کی بنا پر کتاب میں روزمرہ پیش آنے والے معاملات، بازار، مزارعت، شرکت اور خاندانی مسائل بکثرت ملتے ہیں۔

ایک تنقیدی پہلو بھی قابلِ ذکر ہے: کتاب میں زیادہ تر احکام بصورتِ نقل و ترجیح بیان ہوئے ہیں اور استدلال کی تفصیل یعنی آیات و احادیث سے باضابطہ استنباط کی بحث نسبتاً کم ہے؛ جو اس صنف کی عام روش ہے۔ تاہم جہاں کوئی مسئلہ دقیق یا اختلافی ہو وہاں قاضی خان وجہ و علت کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ اسی متوازن روش نے کتاب کو نہ خشک نقل کا مجموعہ رہنے دیا اور نہ اسے طویل اصولی مباحث میں الجھایا۔

فقہ حنفی میں کتاب کا مقام

فتاویٰ قاضی خان کو فقہ حنفی کے معتمد فتاویٰ میں صفِ اول کا مقام حاصل ہے۔ اس کی معتبریت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ بعد کے سب سے بڑے فقہی منصوبے "الفتاویٰ الہندیہ" (فتاویٰ عالمگیری) کے مرتبین نے اسے اپنے بنیادی مصادر میں شامل کیا، اور ابن عابدین شامی جیسے محقق نے "ردالمحتار" میں اس سے جا بجا استناد کیا۔ ماوراء النہر، خراسان، عثمانی دور کے ادارہ افتا اور برصغیر کے دار الافتا میں اس کتاب سے فتویٰ دینا معمول رہا ہے۔ حنفی فقہ کی "معتمد کتب" کی جس فہرست میں الہدایہ، فتح القدیر، البحر الرائق اور ردالمحتار آتے ہیں، فتاویٰ کے میدان میں قاضی خان اسی درجے کی کتاب مانی جاتی ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ قاضی خان نے سابقہ روایت کو اپنی تحقیق سے پرکھ کر نقل کیا ہے، لہٰذا بعد کے محققین نے انہیں "اہلِ ترجیح" کے طبقے میں شمار کیا ہے۔ انگریزی، فارسی اور اردو شروح و تراجم کی بجائے اس کتاب کی اہمیت عربی علمی حلقوں میں اس کے اصل متن ہی کی صورت میں زیادہ رہی، اور جدید دور میں اس کے متعدد محتاط ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ فتاویٰ قاضی خان ایک باضابطہ، موثق اور عملی فقہی مجموعہ ہے جس کی ترتیب فقہ کے ابواب پر مبنی ہے، مصادر ظاہر الروایہ و نوادر اور مشائخ کے اقوال پر قائم ہیں، اور طرزِ استدلال میں مسئلہ پیش کر کے روایت و ترجیح کے ساتھ مختصر و جامع جواب دیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس بات کی شاہد ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں افتا محض انفرادی عمل سے نکل کر تدوین و تصنیف کے منظم علمی ادارے کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اسی لیے قاضی خان کا یہ مجموعہ آج بھی حنفی مفتی و محقق کے لیے ناگزیر ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سوال نمبر 4: افتا کی ادارہ جاتی تاریخ: انفرادی عمل سے باقاعدہ نظام تک (20 نمبر)

سوال نمبر 4: اسلامی تاریخ میں افتا انفرادی علمی عمل سے باقاعدہ ادارہ جاتی نظام تک کن مراحل سے گزرا؟ اہم ادوار اور نمایاں تبدیلیوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔ (20 نمبر)

تعارف

افتا کی تاریخ درحقیقت اسلامی علم کی ادارہ جاتی نشوونما کی تاریخ ہے۔ ابتدا میں فتویٰ ایک عالم اور ایک سائل کے درمیان کا خالص علمی و دینی رابطہ تھا؛ پھر فقہی مکاتب، کتبِ فتاویٰ، منصبِ شیخ الاسلام، ریاستی فتویٰ خانے اور جدید دور کے دار الافتاء سبھی اسی بات کی گواہی ہیں کہ یہ عمل بتدریج ایک باقاعدہ ادارے کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ اس ارتقا کے ہر مرحلے کی اپنی وجوہ اور اپنے فوائد و نقصانات ہیں۔ اس جواب میں ان سب کو ترتیب وار میں تقسیم کر کے بیان کیا جائے گا اور آخر میں مجموعی تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

پہلا مرحلہ: عہدِ نبوی و صحابہ

افتا کا آغاز خود وحی کے دور سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں نبی کریم ﷺ سے مسائل پوچھے جانے اور اللہ تعالیٰ کے جواب نازل کرنے کا ذکر لفظ "یستفتونک" کے ساتھ آیا ہے (النساء: 127، 176)، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "مفتیِ اعظم" درحقیقت وحی تھی اور رسول اللہ ﷺ اس کے مبلّغ۔ آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام انفرادی حیثیت سے فتویٰ دیتے رہے؛ حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم فتویٰ کے مشہور مراکز تھے۔ اس دور کی خصوصیات یہ تھیں: فتویٰ خالص شخصی عمل تھا، نہ اس کا کوئی دفتر تھا نہ تحریری ریکارڈ رکھنا لازم؛ مفتی کی سند اس کی صحبت و علم و ثقہ ہونا تھا؛ اور فتویٰ دینے میں احتیاط اس قدر تھی کہ جلیل القدر صحابہ و تابعین مسئلہ ایک دوسرے کی طرف بھیج دیا کرتے تھے تاکہ غلطی کی ذمہ داری سے بچا جائے۔ ابھی افتا نے ادارہ کی صورت اختیار نہیں کی تھی، مگر اس کے آداب و ضوابط کی بنیاد یہیں پڑ گئی۔

دوسرا مرحلہ: فقہی مکاتب اور کتبِ فتاویٰ کا دور

دوسری و تیسری صدی ہجری میں فقہی مکاتب کی تشکیل کے ساتھ افتا میں بڑی تبدیلی آئی۔ اب فتویٰ کسی فرد کی ذاتی رائے کے بجائے ایک مسلک کے اصولوں سے بندھ گیا؛ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی مکاتب نے اپنے اپنے اصول و قواعد وضع کیے اور مفتی اسی دائرے میں فتویٰ دینے لگا۔ اس دور کی سب سے بڑی ادارہ جاتی پیش رفت کتبِ فتاویٰ کی تدوین ہے: نوازل و واقعات کے مجموعے (مثلاً فتاویٰ النوازل)، قرقانہ خان اور بعد میں الفتاویٰ الہندیہ جیسے منظم مجموعات نے فتویٰ کو قابلِ رجوع علمی سرمایہ بنا دیا۔ اسی دور میں مدرسے کے نظام نے افتا کو ایک پیشہ ورانہ مہارت کی صورت دی: طالب علم مدتوں استاد کے پاس رہ کر "تمرینِ افتا" کرتا اور اجازہ حاصل کرتا۔ تبدیلی کا خلاصہ یہ ہے کہ فتویٰ اب اجتہادِ مطلق سے نکل کر "افتا فی المذہب" کی صورت اختیار کر گیا، جس سے یکسانیت و ضابطہ تو پیدا ہوا مگر اجتہاد کا دروازہ عملاً تنگ ہونے کا رجحان بھی شروع ہوا۔

تیسرا مرحلہ: ریاستی سرپرستی اور شیخ الاسلام کا منصب

چوتھی صدی ہجری سے ریاست نے افتا و قضا کو باقاعدہ سرپرستی میں لینا شروع کیا۔ عباسی دور میں "قاضی القضاۃ" کا منصب قائم ہوا جس کے تحت قاضیوں کی تقرری و نگرانی ہوتی تھی، اور افتا بھی اسی نظم سے جزوی طور پر جڑ گیا۔ اس ارتقا کی انتہا سلطنتِ عثمانیہ میں دیکھی گئی جہاں "شیخ الاسلام" کا منصب قائم ہوا جو ریاست کا سب سے بڑا مفتی تھا؛ شیخ الاسلام کے ماتحت دار الافتا، "فتویٰ خانہ" اور "فتویٰ امینی" جیسے عہدے و دفاتر بنے، فتوے باقاعدہ رجسٹروں میں محفوظ ہونے لگے اور ریاستی احکام و سلاطین کے عزل و نصب تک میں فتویٰ مؤثر کردار ادا کرنے لگا۔ ادارہ جاتی شدن کے فوائد واضح تھے: فتویٰ کی اہلیت کا معیار قائم ہوا، جعلی مفتیوں کا راستہ رکا، اور مسائل میں یکسانیت آئی۔ مگر اس کے ساتھ ایک بنیادی تنقیدی پہلو بھی پیدا ہوا: مفتی جب ریاست کا ملازم بن گیا تو فتویٰ پر سیاسی دباؤ کا امکان بڑھ گیا اور بعض مواقع پر فتویٰ حاکم کی مرضی کے تابع دکھائی دینے لگا۔ یہی وہ کشمکش ہے جس سے آج کے اداروں کو بھی واسطہ ہے۔

چوتھا مرحلہ: نو آبادیاتی دور کی تبدیلیاں

انیسویں و بیسویں صدی میں مسلم دنیا کی نو آبادیاتی غلامی نے افتا کے نظام کو جڑ سے ہلا دیا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے سے شیخ الاسلام کا ادارہ ختم ہوا؛ مغربی طرز کی عدالتوں کے قیام سے شرعی قضا کا دائرہ سکڑ کر عموماً عائلی قوانین تک رہ گیا؛ جدید تعلیم کے پھیلاؤ سے مدرسے کا روایتی نظام کمزور ہوا اور افتا کے لیے اسنادی نظام بکھرنے لگا۔ دوسری طرف اسی دور میں افتا کے بچاؤ کی کوششیں بھی ہوئیں: برصغیر میں دار العلوم دیوبند (1866ء) اور دیگر مدارس نے دار الافتا کے مستقل شعبے قائم کیے، تحریری فتاویٰ کے سوالات

باقاعدہ فارم پر لیے جانے لگے اور امداد الفتاویٰ جیسے بڑے مطبوعہ مجموعے سامنے آئے۔ مصر میں "دار الافتاء المصریہ" 1895ء میں سرکاری ادارے کی حیثیت سے قائم ہوئی۔

یوں اس دور میں افتا ایک طرف ریاستی اقتدار سے محروم ہوا مگر دوسری طرف عوامی و علمی سطح پر نئے اداروں کے ذریعے زندہ و منظم رہا۔

پانچواں مرحلہ: جدید ادارے اور اجتماعی افتا

بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی میں افتا کی ادارہ جاتی سرگرمی سب سے زیادہ نمایاں ہوئی۔ قومی سطح پر مفتیِ اعظم کے دفاتر، وزارتی دار الافتا اور شرعی کونسلیں قائم ہوئیں؛ بین الاقوامی سطح پر مجمع الفقہ الاسلامی (جدہ، 1981ء)، المجمع الفقہی الاسلامی (مکہ مکرمہ) اور یورپین کونسل برائے افتا و تحقیق (1997ء) جیسی اکیڈمیاں وجود میں آئیں جن میں مسائل کا فیصلہ انفرادی فتویٰ کے بجائے "اجتماعی اجتہاد" اور باہمی مشاورت سے کرتا ہے۔ ان اداروں نے افتا کو بینک کاری، طب، مالیات اور ٹیکنالوجی جیسے جدید شعبوں کے ماہرین کے ساتھ جوڑا، تحریری قرارات شائع کیں اور انٹرنیٹ کے ذریعے آن لائن افتا کی سہولت عام کر دی۔ ڈیجیٹل دور میں ہر بڑے دار الافتا کی ویب سائٹ و ایپ موجود ہے، مگر اسی کے ساتھ سوشل میڈیا پر غیر اہل افراد کا فتویٰ دینا ایک نیا چیلنج بن کر سامنے آیا ہے جس سے ادارہ جاتی افتا کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔

تنقیدی جائزہ

مجموعی تجزیہ یہ ہے کہ ادارہ جاتی شدن ناگزیر اور بڑی حد تک مفید ارتقا ہے۔ اس کے فوائد یہ ہیں: اہلیت و جواز کا ضابطہ قائم ہونے سے دین کے نام پر سخن سازی رکی؛ مسائل کا حل ماہرین کی مشاورت اور شعبہ جاتی تحقیق کے ساتھ ہونے لگا؛ فتاویٰ کا ریکارڈ محفوظ ہو کر علمی انضباط آیا؛ اور نئے مسائل میں امت کے سامنے مجموعی موقف پیش ہونا آسان ہوا۔ مگر اس کے نقصانات بھی کم نہیں: ریاستی اداروں میں مفتی پر اقتدار کا اثر و رسوخ، فتویٰ کی سست رفتار بیوروکریسی، اور فتویٰ کے "سرکاری مسلک" بننے سے اختلاف کی جائز گنجائش کا خاتمہ۔ دوسری طرف ان اداروں سے باہر آزادی نے بھی افراتفری پیدا کی ہے۔ وسطی راہ یہی ہے کہ ادارہ جاتی افتا کو علمی خود مختاری حاصل ہو، مفتی کی تقرری خالص اہلیت پر ہو، اور اجتماعی اجتہاد کو انفرادی اجتہاد کا بدل نہیں بلکہ تکمیل سمجھا جائے۔ سلف کے دور کی احتیاط و تقویٰ اور جدید دور کی تنظیم اگر جمع ہو جائیں تو افتا اپنا اصل کردار بہتر طور پر ادا کر سکتا ہے۔

نتیجہ

اختتامی کلام یہ ہے کہ افتا نے چودہ صدیوں میں پانچ بڑے مراحل طے کیے ہیں: عہدِ نبوی و صحابہ کا ذاتی علمی عمل، مکاتب و کتبِ فتاویٰ کا تخصصی دور، قاضی القضاۃ و شیخ الاسلام کی ریاستی سرپرستی، نو آبادیاتی زوال و تجدید کا مرحلہ، اور جدید قومی و بین الاقوامی اداروں و اجتماعی اجتہاد کا دور۔ ہر مرحلے نے گزشتہ مرحلے کی کمزوری دور کرنے کی کوشش کی اور اپنی کچھ نئی پیچیدگیاں بھی پیدا کیں۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ فتویٰ کی اصل روح، یعنی دلیل پر قائم رہنمائی، تقویٰ اور امانت، ہر صورت میں محفوظ رہنی چاہیے، خواہ اس کا نظام ذاتی ہو یا ادارہ جاتی۔

سوال نمبر 5: تلفیق اور افتا بہ مذہب الغیر: مفہوم، آراء، شرائط اور عصری اطلاقات (20 نمبر)

سوال نمبر 5: تلفیق اور افتا بہ مذہب الغیر سے کیا مراد ہے؟ فقہا کی مختلف آراء، شرائط اور موجودہ دور میں ان کے عملی اطلاقات کا تحقیقی مطالعہ کیجیے۔ (20 نمبر)

تعارف

فقہ اسلامی کی عملی زندگی میں دو اصطلاحات بار بار زیرِ بحث آتی ہیں: تلفیق اور افتا بہ مذہب الغیر۔ پہلی کا تعلق ایک ہی مسئلے میں مختلف ائمہ کے اقوال کو یوں جمع کرنے سے ہے کہ عمل کی ایک ملی جلی صورت بن جائے، اور دوسری کا تعلق اس سے ہے کہ مفتی اپنے مسلک کے بجائے کسی دوسرے مذہب کے قول پر فتویٰ دے۔ یہ دونوں مسائل قدیم کتابوں میں بھی زیرِ بحث رہے اور آج جب معاملات بین المذاہب شادیوں، جدید مالیات، مغربی ممالک میں آباد اقلیتوں اور طبی جیسے شعبوں میں پیچیدہ ہو گئے ہیں تو ان کی عملی اہمیت پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ تاہم ان کا بے قید استعمال فقہ کو خواہشات کا کھلونا بھی بنا سکتا ہے۔ اس جواب میں دونوں کا مفہوم واضح کر کے فقہا کی آراء، ان کی شرائط اور دورِ حاضر کے اطلاقات کا تحقیقی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

تلفیق کا مفہوم اور اس کی صورتیں

تلفیق لغت میں ٹکڑے جوڑ کر ایک چیز بنانے کو کہتے ہیں۔ اصطلاحِ فقہ میں اس سے مراد کسی ایک مسئلے میں دو یا زیادہ ائمہ مجتہدین کے اقوال کو اس طرح جمع کر کے عمل کرنا ہے کہ نتیجے میں بننے والی صورت کسی ایک مجتہد کے نزدیک اس مرکب حالت میں جائز نہ ہو۔ مثال مشہور ہے: کوئی شخص امام شافعی کے قول پر بغیر ولی کے نکاح کو اور امام ابو حنیفہ

کے قول پر دوسری جزئیات کو جمع کر کے ایسی صورت بنائے جسے دونوں ائمہ میں سے کوئی درست نہ کہے؛ یہی تلفیقِ باطل ہے۔ اس سے علاحدہ ایک جائز صورت بھی ہے: مختلف "مسائل" میں مختلف ائمہ کی تقلید کرنا، مثلاً نماز میں ایک مسلک، زکاۃ میں دوسرے کی رائے پر عمل ہو؛ اسے علما عموماً تلفیق نہیں کہتے بلکہ "تعددِ مذاہب فی المسائل" کہا جاتا ہے اور اس کی گنجائش بہت سے محققین کے ہاں موجود ہے۔ تیسری صورت "تتبع الرخص" ہے، یعنی ہر مسئلے میں سب سے آسان قول تلاش کر کے جمع کرنا، جسے فقہا نے ہوائے نفس کی پیروی قرار دے کر رد کیا ہے؛ امام اوزاعی اور دیگر ائمہ کے اقوال میں ایسے شخص کے بارے میں سخت تنبیہ آئی ہے جو ہر مذہب کی رخصتیں چن کر لے لے۔

افتا بہ مذہب الغیر کا مفہوم

افتا بہ مذہب الغیر سے مراد یہ ہے کہ مفتی، جو عام طور پر اپنے مذہب کے معتمد قول پر فتویٰ دیتا ہے، کسی خاص مسئلے میں دوسرے فقہی مذہب کے قول کو اختیار کر کے اس پر فتویٰ دے۔ اس کی صورتیں مختلف ہیں: کبھی مستفتی خود دوسرے مذہب کا مقلد ہوتا ہے اور اس سے اسی کے مذہب کے مطابق جواب مانگتا ہے؛ کبھی قاضی یا مفتی کے سامنے وہ واقعہ آتا ہے جس کا نظام دوسرے مذہب کے تحت چل رہا ہو؛ اور کبھی ضرورت و مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اپنے مذہب کے قول پر عمل میں حرجِ شدید ہو جبکہ دوسرے مذہب کا قول قوی دلیل رکھتا ہو۔ حنفی محققین، خصوصاً ابن عابدین نے "شرح عقود رسم المفتی" میں اس باب پر تفصیلی کلام کیا ہے کہ مفتی کب اپنے مذہب سے عدول کر سکتا ہے اور کب نہیں۔ دوسرے مذاہب کے ہاں بھی اسی طرح کی بحثیں موجود ہیں، کیونکہ مسئلہ ہر اس نظام میں پیدا ہوتا ہے جہاں افتا کسی مقررہ مذہب کی حدود میں قائم ہو۔

فقہا کی مختلف آراء

اس مسئلے میں فقہا کی آراء تین بڑے رجحانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ پہلا رجحان شدت کا ہے: جمہور متقدمین و محققین کا موقف ہے کہ عام حالات میں نہ تلفیق جائز ہے، نہ اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے پر فتویٰ دینا؛ کیونکہ اس سے فقہی نظام کا ضبط ٹوٹتا ہے، عام آدمی کے لیے دین خواہشات کے تابع ہو جاتا ہے اور "تتبع الرخص" کا دروازہ کھلتا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک جس مذہب کی تقلید اختیار کی گئی ہے اس کے معتمد قول کی پابندی لازم ہے۔ دوسرا رجحان اعتدال کا ہے: ابن الہمام، ابن نجیم، ابن عابدین اور شاہ ولی اللہ جیسے محققین نے ضرورت، عمومِ بلویٰ اور حرجِ شدید کی صورت میں دوسرے مذہب کے قوی قول پر عمل اور فتویٰ کی اجازت دی ہے، مگر سخت شرائط کے ساتھ۔ شاہ ولی اللہ نے "الانصاف" اور "عقد الجید" میں تقلید و اختلاف کے آداب پر جو کلام کیا ہے وہ اسی اعتدال کی نمائندگی کرتا ہے۔ تیسرا رجحان دورِ جدید کے بعض اہلِ علم کا ہے جو

اجتماعی اجتہاد کے اداروں کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ مصلحت و دلیل کی قوت کی بنیاد پر کسی بھی مذہب کا قول منتخب کر کے قانون یا فتویٰ کی بنیاد بنائیں؛ مصر و دیگر ممالک کے بعض عائلی قوانین میں مختلف مذاہب سے انتخاب اسی کی عملی مثال ہے۔ محققانہ رائے یہ ہے کہ دوسرا رجحان اقرب الی الصواب ہے کیونکہ یہ نہ نظام توڑتا ہے نہ انسان کو لاینحل مشقت میں ڈالتا ہے۔

جواز کی شرائط

جن فقہا نے تلفیق یا افتا بہ مذہب الغیر کی اجازت دی ہے انہوں نے اس کے لیے درج ذیل شرائط مقرر کی ہیں:

- حقیقی ضرورت یا حرجِ شدید موجود ہو؛ محض آسانی پسندی یا خواہش کافی نہیں۔
- جس قول کی طرف رجوع کیا جائے وہ کسی معتبر مجتہد کا قول ہو، شاذ و متروک رائے نہ ہو، اور اس کی دلیل کم از کم قابلِ اعتبار ہو۔
- تلفیق سے ایسی مرکب صورت نہ بنے جسے تمام ائمہ باطل قرار دیں اور جس سے مسئلے کی بنیاد ہی ختم ہو جائے (مثلاً ایسی عبادت جو ہر مسلک میں فاسد ہو)۔
- اجتماعی احکام اور قطعی نصوص کی خلاف ورزی نہ ہو؛ تلفیق کا دائرہ اجتہادی مسائل تک محدود ہے۔
- جس معاملے میں عمل شروع ہو چکا ہو اور اس کے تحت حقوق قائم ہو گئے ہوں (مثلاً طلاق واقع ہو چکی ہو) اس میں بعد میں دوسرے قول لے کر نتیجہ بدلنے کی کوشش نہ کی جائے۔
- عمل وقتی ضرورت کی حد تک ہو؛ اسے مستقل مسلک ترک کرنے یا ہر مسئلے میں رخصت ڈھونڈنے کی عادت نہ بنایا جائے۔

ان شرائط کا مقصد یہ ہے کہ آسانی کا یہ دروازہ فقہ کے نظام کو تحلیل کیے بغیر کھلے۔ جہاں یہ شرائط پوری ہوں وہاں علما نے عمل کی اجازت دی ہے؛ مثلاً بعض معاملات میں ایک شخص کے لیے اپنے مذہب کا قول ناقابلِ عمل ہو جائے اور دوسرے مذہب کا قول قوی بھی ہو اور اجتماعی بھی، تو قاضی و مفتی کے پاس راستہ موجود رہتا ہے۔

موجودہ دور کے عملی اطلاقات

دورِ حاضر میں اس بحث کے اطلاقات کئی میدانوں میں نظر آتے ہیں۔ پہلا میدان عائلی قوانین ہے: مسلم ممالک کی قانون سازی میں خلع، شقاق کی صورت میں تفریق، اور لاپتہ شوہر کی بیوی جیسے مسائل میں کئی ملکوں نے حنفی مذہب سے آگے بڑھ کر مالکی قول کو قانون کی بنیاد بنایا، جس سے ہزاروں خواتین کو لایخل اذیت سے نجات ملی؛ برصغیر کی "قانونِ تحلیلِ نکاحِ مسلم" (1939ء) اس کی معروف مثال ہے۔ دوسرا میدان مالیاتی و طبی مسائل ہیں جہاں عضوی عطیہ، بینکاری معاملات اور انشورنس جیسے موضوعات پر فقہی اکیڈمیاں کبھی کبھار کسی ایک مذہب کے قول کو دلیل کی قوت پر منتخب کر لیتی ہیں۔ تیسرا میدان مسلم اقلیتیں ہیں: مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے "فقہ الاقلیات" کے تحت نماز، روزے، حلال غذا اور شہری معاملات میں بعض مقامات پر اسی اصول سے وسعت پیدا کی جاتی ہے۔ چوتھا میدان بین المذاہب عدالتیں ہیں جہاں قاضی فریقین کے اپنے مذہب کے مطابق بھی فیصلہ کر سکتا ہے۔ ان اطلاقات پر تحقیقی تنقید بھی جاری ہے کہ انتخاب کا اختیار اجتماعی اداروں کے ذریعے باقاعدہ ضابطے سے ہونا چاہیے، انفرادی سطح پر نہیں، تاکہ یہ سہولت انتشار کا ذریعہ نہ بنے۔

نتیجہ

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تلفیق اگر ایسی مرکب صورت پیدا کرے جو ہر مجتہد کے نزدیک باطل ہو، یا اس کا محرک محض خواہش و رخصت پرستی ہو تو وہ ممنوع ہے؛ اور اپنے مذہب سے عدول کر کے دوسرے مذہب پر فتویٰ دینا بھی عام اصول کے طور پر جائز نہیں۔ تاہم حقیقی ضرورت، حرجِ شدید اور قوتِ دلیل کی صورت میں، مقررہ شرائط کے تحت، محققینِ فقہ نے اس کی گنجائش دی ہے، اور جدید عائلی قانون سازی و اقلیتی فقہ میں اس کے ثمرات واضح ہیں۔ درست منہج یہ ہے کہ یہ اختیار فرد کی خواہش کے بجائے اہلِ علم و اجتماعی اداروں کے ضابطے کے تحت استعمال ہو، تاکہ شریعت کی آسانی بھی حاصل رہے اور اس کا نظام بھی قائم رہے۔